اُردو مثنوی کا ارتقا

عبدالقادر سروری

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

Scanned with CamScanner

۹

مثنوی اپنے عروج پر

جب دہلی اجڑنے لگی تو دہلی کے اکثر علماء اور شعراء اودھ کے حکمرانوں کی سرپرستی میں پناہ لینے کے لئے ترک وطن کر کے فیض آباد اور لکھنؤ میں آکر بس گئے۔ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر لکھنؤ میں شعر وسخن کی ایسی گرم بازاری ہوئی کہ یہ خطہ رشک دہلی بن گیا۔ یہاں اتنے اچھے اچھے شاعر جمع ہو گئے اور نشوونما پائے کہ یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا اردو مرکز بن گیا۔ اردو شاعری کے ساتھ جدید عصری مثنویوں کا ارتقاء بھی یہیں ہوا

لکھنؤ میں مثنویاں دہلی کے دور کے مقابلے میں بہت لکھی گئیں لیکن ان کا شعری پایہ بہت بلند ہے۔ قدیم بسیط اردو مثنویوں کے نمونے، نہ دہلی کے شعراء کے پیش نظر تھے، نہ لکھنؤ کے شعراء ان سے پوری طرح واقف تھے۔ اس طرح لکھنؤ کی ترقی یافتہ مثنویاں قدیم مثنویوں سے بہت کم متاثر ہوسکیں۔ تاہم ایک محرک جو ان کے درمیان مشترک تھا، وہ فارسی مثنوی کے

Scanned with CamScanner

نمونے ہیں۔ اسی لئے لکھنؤ کی مثنویوں کا ارتقا بھی کم و بیش قدیم مثنویوں کی طرز پر ہوا۔ یہاں بھی مثنوی اور خاص طور پر بلند پایہ مثنویاں قصّوں ہی کے لئے استعمال کی گئیں۔

لکھنؤ کے ابتدائی مثنوی نگاروں کے سامنے، دہلی کے اساتذہ کے نمونے تھے بلکہ ان میں سے اکثر شاعر ایسے تھے جو دہلی سے آئے تھے۔ اس لئے چند مثنویاں جیسے میر سوز اور قیام الدین قائم وغیرہ کی جو ابتدا میں لکھی گئیں وہ بالکل دہلی کی طرز کی تھیں۔ قائم نے اس میں شک نہیں کہ ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ چنانچہ ان کی مثنویاں مکمل اور کسی قدر بسیط قصوں پر مشتمل ہیں۔ مصحفی جیسا استاد فن ان کی مثنویوں کی تعریف کرتا ہے۔ تاہم یہ اعلیٰ درجہ کی مثنویوں میں شمار نہیں ہوتیں۔ اسی طرح میر قمرالدین خاں منت کی مثنویاں یا خواجہ میر درد کے شاگرد ہدایت اللہ خاں ہدایت کی مثنوی شہر بنارس کی تعریف میں اچھی مثنویاں ہیں۔ لیکن ان کی انفرادی خوبیاں ایسی نہیں کہ انھیں بلند پایہ مثنویوں میں جگہ دی جا سکے۔ ان میں سے اکثر کم و بیش طویل نظمیں ہیں۔ اسی لئے یہ مثنویاں ان کی غزل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ چمک نہ سکیں۔

اس عہد کے آغاز میں ایک اچھی مثنوی میرزا علی لطف نے لکھی تھی جو "نیرنگ عشق" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مصحفی اور جرأت کی مثنویوں

کے مقابلہ میں کسی قدر طو ۔ ہے، اور اس کی زبان میر کی مثنویوں کی زبان
کی طرح سادہ اور سلیس ہے۔ اس میں ایک شاہ صاحب کا قصہ منظوم کیا گیا
ہے، جو ایک دلہن کے حسن پر جس کا محافہ ان کے تکیے کے قریب کچھ دیر کے
لئے رکا تھا، ایسے فدا ہو جاتے ہیں کہ جب محافہ روانہ ہو جاتا ہے تو جاں بحق
ہو جاتے ہیں۔ اس کی خبر جب لڑکی کو ملتی ہے وہ شاہ صاحب کی قبر پر
آکر جان دے دیتی ہے۔

متوسط دور میں مثنوی کا معیار لکھنؤ میں دراصل میر حسن کی مثنوی
"سحر البیان" کے لکھے جانے کے بعد بلند ہوا۔ حسن اتفاق سے یہ مثنوی لکھنؤ کے
ادبی ارتقاء کے ابتدائی زمانے میں لکھی گئی اور اسی لئے بعد کے مثنوی نگاروں
کے سامنے ایک بلند معیار قائم ہو گیا۔ اس معیار تک پہنچنے کی اکثروں نے
سعی کی، لیکن وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

اس میں شک نہیں کہ "سحر البیان" طوالت اور بسیط مرقعوں کے اعتبار
سے قدیم عہد کی مشہور مثنویوں کو نہیں پہنچ سکتی۔ تاہم یہ متوسط طول لے اعلیٰ
پایہ ادبی کارنامہ کی حیثیت سے اردو میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ اگلی اور پچھلی
تمام مثنویوں کے مقابلے میں اس کی چند ممتاز خصوصیات ہیں جس کے
سبب وہ اس صنف کی سب سے بہتر پیداوار سمجھی جاتی ہے۔

بے نظیر اور بدر منیر کی داستانِ عشق اپنے فوق الفطرت عناصر اور

نصب العینی ماحول کے باوجود حیات انسانی کی اصلی اور بنیادی صداقتوں اور فطرت انسانی کی غیر متغیر حقیقتوں سے معمور ہے۔ وہ ایک مسلسل قصہ ہے اور عمدہ فن کاری کا نمونہ۔ کردار نگاری میں بھی میر حسن نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا، جو پہلا اور منظوم قصوں کی حد تک آخری قدم بھی تھا۔ میر حسن نے نجم النسا کا جو نسوانی کردار اٹھایا ہے وہ فطرت انسانی کی بنیادوں پر قائم ہے۔ میر حسن کے جذبات نگاری کے مرقعے اور عمیق مشاہدات، مناظر اور بیانات نہایت واضح اور پر کیف ہیں۔ سب سے بڑھ کر ان کی زبان کی لطافت، سادگی اور شیرینی ہے جہاں یہ دونوں خصوصیات شامل ہو جائیں، ایک بلند پایہ فنی کارنامے کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ میر حسن کے مکالمے دہلی کے مثنوی نگاروں کے مقابلے میں زیادہ بسیط اور قدیم مثنوی نگاروں کے مقابلے میں موجودہ روزمرہ کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے ان کے کارنامے کا لطف لازوال ہو گیا ہے۔ "سحر البیان" اسی حد تک نصب العینی ہے کہ اس میں ایک خیالی دنیا پیش کی گئی ہے لیکن یہ خیالی دنیا، دراصل جن اجزا سے تعمیر ہوئی ہے، وہ میر حسن کے اطراف کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے "سحر البیان" صرف ایک نصب العینی دنیا کا قصہ ہی نہیں بلکہ ان کے زمانے کی معاشرتی حالت مذاق اور طرز زندگی کا ایمائی مرقع ہے۔

یہی وہ امور ہیں جن کی وجہ سے میر حسن کی مثنوی کو ادبی کارناموں میں بلند تر جگہ دی جاتی ہے۔ اس مثنوی کا اثر معاصرین پر اور بعد کے شعرا پر یہ ہوا کہ لکھنؤ کے اکثر شعرا نے مثنوی کو شاعری کی اصناف میں خاص طور پہ داخل کر لیا اور اس پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ لیکن جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہے "سحرالبیان" کے رتبہ تک بہت کم مثنوی نگاروں کے کارنامے پہنچ سکے۔

میر حسن نے دو اور مثنویاں "رموز العارفین" اور "گلزار ارم" بھی لکھی تھیں، لیکن اب وہ صرف تاریخ ادب کی زینت ہیں۔

میر حسن ہی کے زمانے کے ایک قادرالکلام شاعر، مرزا محمد تقی خاں ہوس نے "لیلیٰ مجنوں" کو نظم کا جامہ پہنایا۔ لیکن ان کی مثنوی کو بہت کم شہرت حاصل ہوئی۔ کیوں کہ "لیلیٰ مجنوں" کی داستان اردو والوں کے لئے نئی نہیں تھی۔ پھر میر حسن کا انداز بیان بھی ہوس کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تکلف اور تصنع کی طرف زیادہ مائل تھے۔ ان کی شاعری کی اس خصوصیت نے "لیلیٰ مجنوں" کو بہت زیادہ چمکنے نہ دیا۔

ہوس میر حسن کے دبستان کے شاعر نہیں تھے۔ لیکن جرأت اور مصحفی دونوں جو میر حسن ہی کی سی روانی اور سلاست زبان اور لطف گویائی پر فی الجملہ دسترس رکھتے تھے، دراصل غزل کے اساتذہ تھے اس لئے جب

Scanned with CamScanner

وہ مثنوی لکھنے بیٹھے تو ایک مثنوی کو بھی "سحر البیان" کے درجہ تک نہ پہنچا سکے۔ مصحفی کی مثنوی "بحر المحبت" کا قصہ میر کی مثنوی "دریائے عشق" سے ماخوذ ہے۔ اس قصے کو لینے کا مقصد ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کو بڑھا چڑھا کر "سحر البیان" کے درجہ تک پہنچایا جائے۔ لیکن وہ اپنی تمام کوشش اور موشگافیوں کے باوجود میر تک بھی نہ پہنچ سکے۔

مستعمل موضوع میں ہمیشہ یہ خرابی ہوتی ہے کہ نقش ثانی جب تک نقش اول سے بلند پایہ نہ ہو، قابل اعتنا نہیں رہتا۔ یہی "بحر المحبت" کے ساتھ بھی ہوا۔ جس خیال کو میر نے سادھے سیدھے انداز میں پیش کیا تھا اسے مصحفی نے مصنوعی سا بنا دیا۔ مثلاً ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:

ایک جا اک جوان رعنا تھا　　لالہ رخسار سرو بالا تھا　　میر

ایک جا اک جوان خوش ظاہر　　تھا نپٹ فن عشق سے ماہر　　مصحفی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ　　میر

صبر بھاگا بدیدۂ گریاں　　ناشکیبی سے بندھ گیا پیماں　　مصحفی

مصحفی نے اگر کوئی نیا قصہ انتخاب کیا ہوتا یا کم از کم میر جیسے بلند پایہ صناع سے مواد نہ لیا ہوتا، تو ان کی مثنوی طبعزاد ہونے کی وجہ سے ایک مقام پیدا کر لیتی۔

Scanned with CamScanner

جرأت نے کئی مثنویاں لکھیں اور غالباً میر حسن پر فوقیت لے جانے کے خیال سے انھوں نے بھی اثرؔ اور میرؔ جیسے استادانِ فن کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ چنانچہ ان کی اکثر مثنویاں مختصر اور محض کیفیات یا مناظر کے مرقعے ہیں۔ صرف دو مثنویاں طویل ہیں۔ ایک "کارستانِ الفت" اور دوسری خواجہ حسن کے عشق کی داستان جو "حسن و عشق" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مثنوی زیادہ اہم ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا قصہ طبعزاد ہے اور غالباً اس کے اکثر جزئیات حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس میں فوق الفطرت عناصر بھی نہیں ہیں اور اس کا اخلاقی پہلو بھی نہایت موثر ہے لیکن اسلوب بیان میں نہ میر کی سی سادگی ہے اور نہ میر حسن کی سی سادہ پرکاری۔ وہ میرؔ کی طرح قصے پر زیادہ نظر رکھتے ہیں اس لئے میر حسن کے سے مرقعے اس میں نہیں پیدا ہو سکے۔

سعادت یار خاں رنگینؔ نہایت جدت پسند شاعر تھے۔ لیکن ان کی فکر کی فراوانی اور جدت کے حد سے بڑھے ہوئے شوق نے ان کی مثنویوں کو حسن خیال اور لطف گفتار کا نمونہ بننے نہ دیا۔ کہنے کو تو انھوں نے کئی مثنویاں لکھیں لیکن ان میں سے ایک بھی اعلیٰ پایہ کی نہیں ہے۔ وہ لطف جو قصہ نگار مثنوی گو اپنی مثنویوں میں پیدا کر سکتے ہیں اس سے بھی یہ اس وجہ سے محروم رہے کہ انھوں نے واقعات پر مشتمل مثنویاں لکھی ہیں چنانچہ ان کی

مثنویوں کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر سے زیادہ واقعات لکھنا چاہتے ہیں۔

غرض اس عہد کے مثنوی نگاروں کی اس کثیر تعداد میں سے کسی کا کارنامہ لازوال ادبی شہرت کا مالک نہ بن سکا۔

آتش کے شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیم کے ہاتھ میں مثنوی نے ایک نیا جون بدلا۔ نسیم کے زمانے تک لکھنؤ کی سوسائٹی پر شاعرانہ نزاکت پسندی اس قدر غالب آگئی تھی کہ پڑھے لکھے لوگ ایک طرف رہے، عوام بھی بول چال میں شاعرانہ صنعتوں کو ملحوظ رکھنا لازمۂ علم مجلس سمجھتے تھے۔ نسیم جو اپنے عہد کی حقیقی پیداوار تھے، صنّاعی کا ایک اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اس لئے جب انھوں نے "گلزارِ نسیم" لکھی تو اس کو مشرق کی مخصوص صناع ذہنیت کا ایک یادگار نمونہ بنا دیا۔ میر حسن کے بعد، لکھنؤ کی یہ دوسری بلند پایہ مثنوی ہے، جس کو اردو کے غیر فانی کارناموں میں جگہ مل سکتی ہے۔

"گلزارِ نسیم" کا قصہ ہندوستان کا ایک مشہور قصہ ہے۔ لیکن نسیم نے اسے اپنے اسلوب کی ندرت کی وجہ سے زندہ کر دیا ہے۔ چنانچہ بعد کے کئی قصہ نگاروں کے لئے نسیم ہی کا کارنامہ نمونہ بنا۔ اس مثنوی کی سب سے نمایاں خوبی اس کا صنعت گرانہ انداز بیان ہے جس میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بغیر کسی لطف کے التزام کے نہیں کہی جاتی۔ اس کے استعاروں

Scanned with CamScanner

اور تشبیہوں کی ندرت، محاوروں اور صنعتوں کا لطف، ایجاز اور شعریت اسی کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں۔ اس اسلوب کی مثنوی دوسری نہیں ملتی ۔ یہ حقیقت میں حسن کاری کا ایک خاص انداز ہے۔ لکھنؤ کے آخری ایام کے شائستہ ترین مذاق کی یہ ادبی یادگار بھی "سحرالبیان" کے دوش بدوش زندہ رہے گی ۔

"گلزارنسیم" کا قصہ نہایت دلچسپ ہے اور اس کا اخلاقی پہلو بھی بلند ہے۔ "سحرالبیان کی طرح اس میں بھی انسانی نفسیات، فطرت اور جذبات کے نفیس مرقعے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ لیکن "گلزارنسیم"، جزئیات میں بھی زیادہ نصب العینیت کو ملحوظ رکھتی ہے۔ اس کے مقابلے میں "سحرالبیان" کے منفرد اجزار، حیات کے زیادہ قریب ہیں۔

"سحرالبیان" ہی کی طرح "گلزارنسیم" بھی بعد کے مثنوی نگاروں کے لئے ایک معیار بن گئی۔ اکثروں نے اس کی تقلید کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی بہت کم لوگوں کو ہوئی۔ شررؔ نے اس زمانے کی ایک مثنوی کا ذکر اپنی تصنیف "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں کیا ہے جو آغا علی شمس نے "گلزارنسیم"، کے جواب کے طور پر لکھی تھی اور اس کی بڑی تعریف کی ہے لیکن یہ مثنوی اب دستیاب نہیں ہوتی۔

"گلزارنسیم"، کے بعد اس کی تقلید، جواب یا اس کے اثر کے تحت

Scanned with CamScanner

جتنی مثنویاں لکھی گئیں ان میں آفتاب الدولہ قلق کی مثنوی "طلسمِ الفت" نہایت اہم اور قابل ذکر ہے۔ "تاریخ مثنویات اردو" کے مصنف نے لکھا ہے کہ اہل لکھنؤ اس کی بڑی قدر کرتے ہیں[1]۔ لیکن وہ خود مسٹر رام بابو سکسینہ کے ہم خیال ہیں[2]، اور اس میں کئی سقم نکالتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مثنوی' قصے، اسلوب بیان اور شعری خوبیوں کی وجہ سے اس زمانے کی اکثر مثنویوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قلق نے عام طور پر شاعرانہ موشگافیوں سے بہت کام لیا ہے۔ لیکن یہ زیادہ تر وہیں ہوتا ہے جہاں وہ جزئی تفصیلات اور تشریحات سے لطف پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں قصے کے تسلسل کا انھیں خیال رہتا ہے، وہ سادہ سیدھا اسلوب بھی اختیار کرتے ہیں۔ مؤلف "شعرالہند" کی رائے اس کے متعلق زیادہ جنچی تلی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مثنوی "طلسم الفت" "گلزار نسیم" اور "بدر منیر" کا مجموعہ ہے۔ اس میں "گلزار نسیم" کی طرح خیال بندی رعایت لفظی اور تشبیہہ و استعارے کا التزام کیا گیا ہے اور "بدر منیر" کی طرح ہر قسم کے مناظر نہایت تفصیل کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ "گلزار نسیم" کے دبستان کی مثنوی ہے لیکن چونکہ مصنف پنڈت نسیم کا سا صناع ذہن نہیں رکھتا تھا اس لئے اس کو گلزار نسیم کے رتبہ تک نہ پہنچا سکا۔ اس میں

---

[1] تاریخ مثنویات اردو از مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری، زینبی۔ مطبوعہ انوار احمدی الہ آباد ص ۱۵۸

[2] "تاریخ ادب اردو" مرزا محمد عسکری ص ۳۰۶

Scanned with CamScanner

تکلفات کے علاوہ قصّے کے اسقام بھی موجود ہیں، تاہم، اس دبستان کی مثنویوں میں "گلزارِ نسیم" کے بعد سب سے زیادہ پڑھنے کے قابل یہی مثنوی ہے۔

نواب واجد علی شاہ اختر بھی کئی مثنویوں کے مصنف ہیں لیکن ان کی ایک مثنوی "حزنِ اختر" کے سوا کسی میں کوئی خاص بات نہیں۔ مثنوی "غزالہ دماہ پیکر" اور مثنوی "دریائے تعشق" جن میں قصّے بیان کئے گئے ہیں، بہت معمولی رتبہ رکھتی ہیں۔ "دریائے تعشق" پھر بھی کچھ دلچسپ ہے، کیوں کہ اس میں میر حسن کے دبستان کی پیروی کی گئی ہے۔ اس کا قصہ مکمل ہے لیکن شاعرانہ خوبیوں سے عاری ہے۔ "حزنِ اختر" ان کی اپنی داستانِ غم ہے اس لئے اس میں اثر پیدا ہو گیا ہے۔ واجد علی شاہ کی بیگم نواب بادشاہ محل جو عالم تخلص کرتی تھیں۔ ایک اچھی مثنوی کی مصنف تھیں جو "مثنوی عالم" کے نام سے موسوم ہے۔

لکھنؤ کے آخری زمانے کے مثنوی نگاروں میں، نواب مرزا شوق سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اور یہ گویا خصوصی مثنوی نگار ہیں۔ اسی لئے انھوں نے اپنی تمام توجہ اسی صنف پر صرف کی۔ اس کے مقابلے میں، دوسرے مثنوی نگار دراصل غزل گو تھے اور اتمامِ حجت کے طور پر مثنوی پر بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔

شوق کی مثنویوں کا اصلی محرک دراصل محاوراتِ نسواں کا تحفظ تھا۔

Scanned with CamScanner

چنانچہ "بہارِ عشق" کے خاتمہ پر انھوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ اور یہ چیز مثنوی کے لئے ایک انوکھی جدت تھی، اس لئے ان کی مثنویاں بہت مقبول ہوئیں اور شوق کی شہرت عام ہو گئی۔

ان کی تین مثنویاں "بہارِ عشق"، "زہرِ عشق" اور "فریبِ عشق" بہت مشہور ہوئیں۔ پہلی دو مثنویاں خاص دلچسپی رکھتی ہیں۔ ان کے قصے دلچسپ ہیں اور ان میں جذباتِ انسانی کی صورت کشی کی گئی ہے۔ ان قصوں میں فوق الفطرت عناصر نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے افراد زندہ اور چلتے پھرتے انسانوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ "زہرِ عشق" سب سے زیادہ مؤثر اور حزنیہ مثنوی ہے۔ اس کی ہیروئن مہ جبین کے غم میں ہم اپنے آپکو ایک حقیقی انسان کے رنج و غم کی طرح شریک پاتے ہیں۔

مکالمے شوق کی مثنویوں کے بہترین اجزا ہیں۔ ان میں روزمرہ اور محاورہ کا پورا لطف موجود ہے۔ اگر شوق پر اپنے زمانے کے مذاق کا [illegible] نہ ہوتا تو وہ یقیناً ایک بڑے صنّاع ثابت ہوتے۔ بحالتِ موجودہ شوق کی مثنویاں واجد علی شاہ کے زمانے کے تعیش پسند لکھنؤ کے وفا شعار نقشے معلوم ہوتے۔

شوق کے قصے میر کی طرح خلافِ قیاس ضرور ہیں، لیکن ان میں فوق الفطرت عناصر کا نہ ہونا ان کو اگلے تمام قصوں پر امتیاز عطا کرتا ہے۔ یہ

قصہ وار مثنوی کے فن میں حقیقت کی طرف پہلا قدم تھا لیکن یہی آخری قدم بھی ثابت ہوا، کیوں کہ ہمارے شاعر داستانی پیرائے، اپنی زندگی تمام بسر کرنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ ایک پر دوسرے کا اثر مشکل سے پڑ سکتا ہے۔

شوق کے قصوں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ان میں تنوع نہیں ہے۔ انجام سے قطع نظر، جزئیات میں تمام مثنویاں ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہی حال کرداروں کا بھی ہے۔ صرف "زہرِ عشق" کی ہیروئن میں کسی قدر انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ تناسب جو حسن کاری کی جان ہے، ان مثنویوں میں مفقود ہے۔ ہیروئن کی گفتگو کو بے ضرورت طولانی بنا دیا گیا ہے۔ ان تمام امور کے باوجود شوق کی مثنویاں خاص طور پر "زہرِ عشق" اردو ادب میں زندہ رہے گی۔

مذکورہ بالا خصوصی اور مشہور مثنوی نگاروں کے علاوہ لکھنؤ کے عروج کے زمانے میں اور بھی کئی مثنویاں لکھی گئیں۔ ناسخ جو دبستانِ لکھنؤ کے اولین اساتذہ میں سے ہیں، ایک مثنوی "نظمِ سراج" کے مصنف بھی تھے۔ ان کی ایک اور مثنوی میلاد اور مناقب میں ہے۔ لیکن ان کا ذکر صرف ایک بڑے شاعر کی تصنیف ہونے کے تعلق سے کیا جا سکتا ہے۔ مثنوی ناسخ کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ گو "نظمِ سراج" میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے کچھ نقوش مل جاتے ہیں۔ مرزا مہدی حسن خاں آزاد کے ہاں بھی ایک مختصر مثنوی ملتی

ہے۔ لیکن ان کے واسوخت کی شہرت بھی اس مثنوی کو حاصل نہ ہوسکی۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو مثنوی سے خاص لگاؤ تھا اس لئے انھوں نے کئی مثنویاں لکھیں اور ان میں بعض مثنویاں خاص طور پر مشہور ہوئیں اور پڑھنے کے قابل بھی ہیں۔ ان میں "مثنوی داغ نگار"، "داغ دل مہر" اور "مثنوی شعاع مہر" قابل ذکر ہیں۔

سید اسمٰعیل حسین منیر نے تین دیوانوں کے ساتھ ایک مثنوی "معراج المضامین" ائمہ معصومین کے کشف وکرامات پر لکھی ہے۔

شیخ امام بخش ناسخ کے مشہور شاگرد میر وزیر علی صبا نے جو غزل گوئی کے بڑے دلدادہ تھے۔ میر اور سودا کے شکار ناموں کی طرز کی ایک مثنوی "شکار نامۂ واجد علی شاہ" لکھی تھی۔ لیکن اس میں سودا کے شکار ناموں کا شکوہ ہے اور نہ میر کے شکار ناموں کے سے مناظر اور مرقعے۔ اس لئے یہ مثنوی ان کے کلام میں صرف اصناف کے تنوع کی یادگار کے طور پر رہ گئی ہے۔

تیرہویں صدی کے نصف اول میں جب دہلی میں اردو شاعری کو دوبارہ فروغ حاصل ہوا اور مومن، ذوق، غالب، شیفتہ اور داغ جیسے باکمال شعراء پیدا ہوئے تو غزل اپنے عروج کو پہنچ گئی لیکن مثنوی نگاری کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ ذوق جن کے اسلوب کو مثنوی سے مناسبت تھی، اس طرف توجہ نہ کرسکے۔ غالب کے دیوان میں صرف ایک

Scanned with CamScanner

مثنوی" در صفت انبہ" ملتی ہے، جو غالب کے حسن گفتار کا پورا لطف رکھتی ہے لیکن یہ بہت مختصر ہے۔ صرف مومن نے کئی مثنویاں لکھیں اور ان کو محنت اور توجہ سے سرانجام کیا لیکن یہ مختصر مثنویاں ہیں اور جو کسی قدر طویل ہیں، پانچ چھ سو شعر کے درمیان ہیں۔ ان میں بظاہر چند قصے بھی ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب قلبی واردات اور کیفیات کے نقشے ہیں۔ وہ ایک شاعر کا دل اور ساحر کی زبان رکھتے تھے۔ اور جیسا کہ مشہور ہے، عشق و محبت کے راز و نیاز سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ اس لئے ان کی مثنویاں غیر معمولی اثر رکھتی ہیں۔ اس وصف میں شاید نواب مرزا شوق کی حزنیہ مثنویاں ان کی مدمقابل کہلا سکتی ہیں۔ ان سب پر مستزاد مومن کی زبان اور اس کا لطف ہے۔ مثنوی میں وہ سادہ بیانی کی کوشش کرتے ہیں لیکن خیال آفرینی اور لفظی صناعی جو ان کی غزل کا مخصوص وصف ہے، اس سے یہ قطعاً نہیں بچ سکتے تھے۔ تاہم سادگی جو مثنویات کا لازمہ ہے، اس کی رعایت نے ان کے خاص انداز میں ایک اچھا اعتدال اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ان تمام امور کے باوجود یہ مثنویاں کوئی غیر معمولی شہرت اس لئے حاصل نہ کر سکیں کہ میر حسن کے بعد سے مثنوی کا جو معیار اردو خوانوں کے ذہن میں قائم ہو گیا تھا ان پہ یہ پوری نہیں اترتیں۔ یہ محض بیانیہ مثنویاں ہیں یا خاص کیفیات کے مرقعے، بسیط، طویل اور بلند پایہ مثنویوں کی گوناگونی اور قصے کے اعتبار

سے خاکہ کی دلچسپی ان میں موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ نفیس ادبی پارے ہیں اور خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو مومن کی بدیع الاسلوبی سے گھبراتے ہیں، دلچسپ مطالعہ کا کافی مواد رکھتے ہیں۔

امیر کی مثنویاں "نورِ تجلی" اور "ابرِ کرم" بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں کیوں کہ امیر نے اپنی مثنویوں کو خاص محنت اور توجہ سے سرانجام کیا ہے۔ مثنویوں میں امیر نے مذہبی عقائد اور روایات یا مناجاتیں نظم کی ہیں اور نہایت سلاست اور روانی کے ساتھ جو ان کی فکر کا خاصہ ہے۔ زبان کے لحاظ سے یہ دلچسپ ہیں، لیکن ان کے موضوع ادبی اعتبار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

داغ نے صرف ایک مثنوی "فریادِ داغ" لکھی تھی، جو نہایت دلچسپ ہے۔ اس میں حسن و عشق کی وارداتیں بیان کی ہیں۔ زبان میں سلاست کے باوجود، شعری لذتیں موجود ہیں لیکن صرف ایک مثنوی کسی شاعر کے انداز کا تصفیہ کرنے کے لئے بہت ناکافی مواد ہے۔ "فریاد داغ" سے اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اگر داغ اس طرف خاص توجہ کرتے تو یقیناً عمدہ مثنویاں سرانجام کر سکتے تھے۔

عہد متوسط کے آخری شعرا میں اچھے مثنوی نگار، منشی امیر اللہ تسلیم اور محسن کاکوروی ہوئے ہیں۔ ان دونوں کی مثنویاں اپنے مخصوص اور انفرادی

Scanned with CamScanner

رنگ کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں تسلیم نے کئی مثنویاں لکھیں جن کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) دل و جان (۲) نامہ تسلیم (۳) صبح خنداں (۴) نغمہ مسلسل (۵) شوکت شاہ جہانی (۶) سفر نامہ نواب رام پور۔

ان میں قصے بھی ہیں، سوانح اور تاریخیں بھی۔"نامہ تسلیم" میں محمود غزنوی کے قصے کو نظم کیا ہے۔" شوکت شاہ جہانی" تاریخی مثنوی ہے اور نواب رام پور کا سفر نامہ سوانح کی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان میں روانی بھی ہے اور سادگی بھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ لکھنؤ کے آخری شعراء کے تکلفات باردہ سے زیادہ متاثر تھے۔ اسی لئے ان کی مثنویاں کافی طویل ہونے کے باوجود جذبات اور مرقعوں سے عاری ہیں۔ ان میں زیادہ تر واقعات ہیں جو نظم میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں شاعری کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے یہ دراصل تسلیم کی پر گوئی کا سقم ہے۔

محسن کاکوروی متقی اور مذہبی آدمی تھے۔ ان پر مذہب کا اثر گہرا تھا اور دل پر شعریت غالب تھی۔ اس لئے ان کی مثنویاں مذہبی موضوعات پر مشتمل ہیں اور اسلوب شاعرانہ ہے۔ مذہبی موضوعات پر لکھنے والوں میں محسن غالباً سب سے زیادہ نمایاں شاعر ہیں۔ ان کا اسلوب دلکش اور پر لطف ہے۔ اس میں سادگی کے باوجود حسن اور شاعرانہ لطافتیں موجود ہیں۔ ان مثنویوں کے

Scanned with CamScanner

بعض پارے اتنے دلچسپ ہیں کہ زبان زدِ عام ہو گئے ہیں۔ اس خاص انداز میں محسن کو گویا خصوصی مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔ مذہبی نظموں میں لطف گویائی کم شاعروں کے حصّے میں آیا ہوگا۔ ان کی مشہور مثنویاں "چراغ کعبہ"، "صبح تجلی" "نگارستانِ الفت" "فغانِ محسن" ہیں۔

پہلی مثنوی میں معراج کا واقعہ نظم کیا گیا ہے۔ "صبح تجلی" آنحضرت کی ولادت سے متعلق ہے۔ اور یہ دونوں محسن کے شاہ کار ہیں۔ ان میں تغزل کے استعاروں اور کنایوں سے بڑا لطف پیدا کیا گیا ہے۔ یہ سب مثنویاں مختصر اور نفیس ادبی نظمیں ہیں۔

منشی طوطا رام شایاں کی مثنوی "ترجمۂ مہابھارت" اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو مثنویوں میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ شایاں خوش فکر شاعر بھی تھے، اور اپنی ساری شاعرانہ صلاحیتوں کو انھوں نے اپنی مثنوی میں صرف کیا ہے۔

Scanned with CamScanner